رسائل و مسائل

اسلام میں مجالس کے ضبط و نظم کے چند پہلو

سوال:

ہمارے شہر کی جماعت اسلامی نے آپ کی تشریف آوری پر مختلف ملاقاتیوں کے وفود بنا کر ہر ایک کے لئے وقتِ ملاقات مقرر کر دیا تھا۔ ایک شخص ایک وفد کے ساتھ ملاقات کو حاضر ہوا اور اس نے وقت ختم ہو جانے کے بعد دوسرے وفود کی ملاقاتوں کے دوران میں بھی بیٹھے رہنا چاہا، تاکہ وہ مختلف مسائل و معاملات پر آپ کے خیالات سنے، لیکن منتظمین نے اس کی درخواست رد کرتے ہوئے یہ کہا کہ اگر ہر شخص یہی چاہنے لگے گا تو کام نہیں چل سکتا۔

اس طرزِ عمل نے آپ کی طرف جھکنے والوں کا راستہ روک دیا ہے۔ ہم آپ کے ہاں سید المرسلینؐ کا فقر تلاش کرنے آتے ہیں، نہ کہ فقر نما شہنشاہی کی نمائش دیکھنے اور ذلت کے دھکے کھانے کے لئے!

داعی کی حیثیت سے آپ کے لئے ضروری تھا کہ ساری ملاقاتیں اور گفتگوئیں کھلے اجلاس میں فرماتے اور ہر شخص کے لئے اذنِ عام ہوتا کہ وہ مجالس میں شریک ہو۔

اس سے پہلے میرے جذبات کو ایک اور موقع پر ٹھیس لگ چکی ہے۔ مجھے اگست میں ضلعی امیرِ جماعت کا حکم پہنچا کہ میں لوگوں تک یہ اطلاع پہنچا دوں کہ جماعت کے فلاں مقرر تشریف لا رہے ہیں لوگوں نے مجھ سے کہا کہ کہیں ایسا تو نہ ہوگا کہ نام اور کام بتا رہے ہو، اور آجائے کوئی اور! میں نے ان کو یقین دلایا کہ یہ جماعت ایسی نہیں اور اس طرح کے اعلان اس کی طرف سے نہیں ہوا کرتے، لیکن میری بدقسمتی کہ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ اچانک یہ اطلاع ملی کہ صاحبِ مذکور بیمار ہونے کی وجہ سے نہیں آرہے۔ اب مجھے زمین جگہ نہ دیتی تھی کہ میں اس میں گڑ جاتا۔

اس طرح کی توقعات کی شکستگی کی وجہ سے مجھے جماعت کی منزل اور اس کے طریق کار میں شک پیدا ہو گیا ہے۔

جواب:

سوال بہت ہی سرسری قسم کا تھا اور اس کا جواب دو حرفی دیا جانا چاہیے تھا، لیکن چونکہ یہ ایک خطرناک مرض کا پتہ دیتا ہے اور دین (خصوصاً سنت) کے بہت ہی غلط تصور کو سامنے لاتا ہے، لہٰذا کسی قدر توضیح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مسلمانوں میں غیر منظم زندگی بسر کرتے کرتے اب اسلام کے بارے میں کچھ اس طرح کا تصور قائم ہو گیا ہے کہ نظم اور باقاعدگی کی دینی قدر و قیمت کچھ بھی باقی نہیں رہی، بلکہ آج جو کوئی انھیں ٹریننگ اور رہبر کے اسلوب سے ہٹا کر نظم و ضبط سکھانا چاہے تو اسے وہ مشتبہ بالا جانب کا مجرم سمجھتے ہیں۔ یہ ایک انتہائی افسوسناک صورت حال ہے کہ غیر منظم زندگی کو سنتِ ختم المرسلین کا نام دیا جائے اور انتشار بھرے اجتماعات کو فقرِ محمدی کی تعریف میں داخل کیا جائے، جیسے بعض جہلا نے کپڑا باندھے بغیر نہانے کو (نعوذ باللہ) محمدی اشنان کا نام دیا ہے! اس طرح کی باتوں میں دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر غیر ارادی صورت میں یہ بہتان باندھا جاتا ہے کہ دنیا کے اس سب سے بڑے نمونے کے انسان کے ہاں کسی ترتیب و انضباط اور تقسیم کار اور تقسیم اوقات کا سرے سے گزر ہی نہیں تھا۔

جس موقعے کا سائل نے ذکر کیا ہے، کم سے کم اس کے تقاضے محسوس کیے ہوتے کہ ایک عارضی قیام کے دوران میں ایک شخص کو گوناگوں فرائض انجام دینے ہیں۔ اس کے پیشِ نظر جہاں دعوت پہنچانا تھا وہاں جماعت کے نظم کا جائزہ بھی لینا تھا، کارکنوں کی مشکلات کو معلوم کر کے انھیں حل کرنا بھی تھا، ان کی کمزوریوں اور کوتاہیوں پر گرفت بھی کرنی تھی اور انھیں دوسری جماعتوں اور تحریکوں کے بارے میں پالیسی بھی بتانی تھی۔ پھر ایسے موقعوں پر طبقۂ علما سے الگ خطاب کی ضرورت ہوتی ہے، علمی و ادبی کام کرنے والے و رکرز کو الگ پروگرام مہیا کرنا ہوتا ہے۔ پھر بعض لوگوں سے علیحدگی میں گفتگو کرنی پڑتی ہے اور بعض کے نجی مسائل کے بارے میں دین کے احکام واضح کرنے ہوتے ہیں ـــــــ لیکن آپ فرماتے ہیں کہ یہ سارے کام ایک مجلسِ عام میں ہونے چاہییں جس میں ہر شخص کو اذنِ عام ہو۔ ذرا غور تو فرمائیے کہ کیا اس طرح کوئی ایک کام بھی مقررہ وقت پر انجام پا سکتا ہے؟ ایسے مواقع پر تقسیمِ اوقات اور تقسیم کار کا اصول اختیار کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ یہ سنتِ رسول کے خلاف ہے۔ ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ سنت کا یہ تصور آپ نے لیا کہاں سے ہے کہ وہاں ہر کام ہر وقت ہوتا رہتا تھا اور ہر مجلس لازماً عام ہی ہوتی تھی؟ خدا جانے کس صاحبِ ذوق سے آپ نے حدیث و سنت کا درس لیا ہے۔

سنت کی وسعتوں میں تو خیر بعد میں جائیے، پہلے آپ قرآن کریم ہی سے مجالس کے بارے میں نظم کے تقاضوں کو معلوم فرمائیے۔ کم سے کم ذیل کے احکام و آداب پر آپ کی نظر ہونی چاہئے تھی:۔

(۱) نمازِ جمعہ کے اجتماع کے بارے میں قرآن نے خاص طور پر یہ حکم دیا کہ "اذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض" یعنی نماز کی کارروائی کے ختم ہوتے ہی منتشر ہو جاؤ اور جا کر اپنے اپنے معمولات میں لگ جاؤ۔ یہ حکم آخر دیا کیوں گیا؟ محض اس لئے کہ نماز جمعہ کے بعد ملاقاتیوں کا ہجوم نبی صلعم کو مجبور کر دیتا ہوگا کہ وہ دوسرے فرائض کی ادائی اور پہلے سے طے شدہ پروگراموں کی تکمیل پر متوجہ نہ ہو سکیں، بلکہ مشتاقانِ زیارت اور دلدادگانِ مجلس آرائی کے شخصی جذبات کی تسکین میں لگے رہیں۔ حالانکہ ایک ایسی ہستی جو ایک پورے معاشرے کی انچارج اور ایک ملک گیر تحریک کی عناں بردار تھی اس کے اوقات بہت سے اہم مقاصد کے لئے وقف ہونے تھے۔ چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ نمازِ جمعہ (اور اسی طرح دوسری نمازوں) کے خاتمے پر منتشر ہو جایا کریں، بجز اس صورت کے کہ کوئی ضروری معاملہ ہو یا نبی صلعم خود مجلس کو جاری رکھنا چاہیں۔

(۲) یہ ہدایت نماز ہی تک محدود نہ رہی، بلکہ مسلمانوں کو یہ بھی سکھانا ضروری ہوا کہ نبی صلعم جب انہیں اپنے ہاں کھانے پر بلائیں تو ان کو کھانے کے بعد بیٹھ کر "حدیثِ مائدہ" میں نہ لگ جانا چاہئے، کیونکہ اس طرح رسول اللہ کو مروتاً بیٹھنا پڑے گا، حالانکہ آپ پر مصروفیات اور ذمہ داریوں کا بار بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ صاف صاف کہا گیا کہ کھانے سے فارغ ہوتے ہی گھروں کو چلے جایا کرو۔

(۳) پھر سورۂ نور میں فرمایا کہ "واذا کانوا معہ علیٰ امر جامع لم یذھبوا حتیٰ یستاذنوہ" یعنی خدا اور رسول پر ایمان لانے والے جب رسول اللہ کی خدمت میں کسی اجتماعی ضرورت کے لئے مجتمع ہوتے ہیں تو وہ بدون اجازت پورا کام ختم ہونے سے پہلے چلے نہیں جاتے۔ یہ ان مجالس کا ذکر ہے جو تفریحاً نہیں بلکہ کسی "امر جامع" کے لئے منعقد ہوں۔ ان مجالس میں وہی آئے جس کا تعلق کسی پیشِ نظر "امر جامع" سے ہو اور اس

"امرِ جامع" کے بارے میں کسی نتیجے پر پہنچنے سے قبل کارروائی کے دوران میں کوئی اٹھ کر نہ جائے لیکن جب اس "امرِ جامع" کی کارروائی ختم ہو جائے تو پھر لوگوں کو اسی طرح منتشر ہو جانا چاہیئے جس طرح جمعہ کے "امرِ جامع" اور ضیافت کے "امرِ جامع" کے بارے میں حکم ہے۔ علاوہ بریں چونکہ ہر امرِ جامع کا تعلق ہر شخص سے ہونا ضروری نہیں، لہٰذا یہ بات از خود واضح ہے کہ کسی خاص "امرِ جامع" کے لئے شرکتِ اجلاس وہی لوگ کریں جو اس سے متعلق ہوں اور جن کو ایک خاص وقت کے لئے دعوت یا اذن ملے۔

(۴) قرآن میں آنحضور صلعم کے ساتھ علیٰحدگی میں گفتگو (نجویٰ) کرنے کے بارے میں بھی ہدایات وارد ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک بڑا کام کرنے والوں کو اس کی ضرورت پیش آتی ہے کہ لوگ علیٰحدگی میں ان کے سامنے اپنی رپورٹیں پیش کریں اور اپنی مشکلات میں مشورہ چاہیں، یا تنہائی میں ان سے بازپرس کرنی پڑے۔ ایسے موقعوں کے لئے شریعت کا قاعدہ یہ ہے کہ کسی علیٰحدگی کی گفتگو کو سننے کی کوشش نہ کی جائے اور نہ علیٰحدگی کی مجالس میں گھسنے کے لئے تگ و دو کی جائے۔

واضح رہے کہ اہم معاملات اور اطلاعات کے متعلق قرآن کا یہ حکم کہ ان کو عام طور پر نشر نہ کیا جائے بلکہ صرف متعلقہ اربابِ امر تک انھیں پہنچانا چاہیئے جو ان کے بارے میں رائے قائم کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں، خود اس بات کا داعی ہے کہ بعض ملاقاتوں اور مجالس کو مخصوص کرنا ضروری ہوتا ہے۔

(۵) قانونِ استیذان یوں تو براہِ راست گھروں میں داخلہ سے تعلق رکھتا ہے، لیکن اوپر کی سطور بتاتی ہیں کہ دفتروں، کارخانوں، سرکاری اداروں اور بخصوصیت سے مجالسِ مشاورت میں داخلے کے لئے بھی اس اسلامی ادب کو اختیار کرنا چاہیئے۔ اب اگر کسی خاص موقع پر بہت سے ملاقاتیوں کو منظم طریق پر تقسیم اوقات کر دی جائے تو یہ عین اسی قانون کے تحت ہوگا۔ لیکن فرض کیجئے کہ ایک سلسلۂ مجالس میں اس سرے سے اس سرے تک شرکت کے لئے کوئی شخص خواہش کرتا ہے اور اس کے استیذان کا جواب اثبات میں نہیں ملتا تو قرآن نے اسے یہ سبق دیا ہے کہ اذن نہ ملنے پر وہ بغیر کسی ناخوشگوار تاثر کے لوٹ جائے۔

(۶) سب سے آخر میں ہم اس قطعی حکم کو بیان کرتے ہیں جو مجالس کے بارے میں شرکا کو دیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اذا قیل لکم تفسحوا فی المجالس فافسحوا یفسح اللہ لکم ج واذا قیل انشزوا فانشزوا۔

یعنی جب کسی مجلس عام کا موقع ہو اور تم سے چاہا جائے کہ مزید آدمیوں کو داخل ہونے کا راستہ اور بیٹھنے کے لئے جگہ دو تو سکڑ سمٹ جاؤ اور مجلس کا حلقہ وسیع ہونے دو، لیکن دوسری طرف جب مجلس کو محدود کرنے کے لئے یا کسی نئی مجلس کو طلب کرنے کے لئے تم کو اشارہ ملے تو پھر خوشدلی کے ساتھ اٹھ جاؤ۔

براہِ کرم ان ہدایات کو سامنے رکھ کر سوچئے کہ ان کی ضرورت پیش کیوں آئی تھی؟ ——— محض اس لئے کہ پورا عرب بدنظمی اور انتشار کی زندگی کا پرانا عادی تھا۔ ایک ایک شخص اپنے جذبات کے آبگینے لئے ہوئے تھا جن کو اجتماعی معاد کا ہر تقاضا ٹھیس لگا دیتا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ ان کو غیر منظم زندگی بسر کرنے کی کھلی چھٹی حاصل رہے۔ ان کا بھی جی چاہتا تھا کہ وہ اگر کسی مجلس میں آ بیٹھیں تو گھنٹوں بیٹھے رہیں، ہر گفتگو اور مشورے میں ان کو شامل ہونے کا موقع ملے، وہ رسول اللہ صنعم کا جو وقت بھی لینا چاہیں لے سکیں اور ہر بحث میں شرکت کا اذنِ عام انھیں حاصل رہے۔ لیکن قرآن نے ان کے جذبات کے آبگینوں کی پروا کئے بغیر ان کو ڈسپلن میں کس دیا، انھیں باقاعدگی کی تعلیم دی اور تقسیم اوقات اور تقسیم کار کا سبق پڑھایا۔ یہ احکام و آداب خود بتاتے ہیں کہ عربوں میں مجالس کے بارے میں کن کن پہلوؤں سے بے ڈھنگا پن موجود تھا، اور اس پر گرفت کر کے اصلاح کی تدبیریں اختیار کی گئیں۔ یہ عربوں کی سعادت تھی کہ انھوں نے تربیتِ نظم پر ناک بھوں چڑھانے کے بجائے اپنے آپ کو نئے سانچے میں ڈھلنے کے لئے پیش کر دیا۔

شریعت میں جو چیز منع ہے وہ صرف یہ ہے کہ ملاقات کرنے والوں اور اپنے معاملات میں مشورہ لینے والوں یا اسلام کا حکم معلوم کرنے والوں پر بطور کبر اپنے دروازے بند نہ کئے جائیں، نہ ان کو ٹھاٹھ باٹھ کے مظاہروں سے مرعوب کیا جائے، اور نہ ان سے اختلاط رکھنے کو اپنے لئے وجہ ذلت سمجھا جائے۔ اگر ایک شخص کے طرزِ عمل میں ایسی کوئی چیز نہیں پائی جاتی، لیکن وہ قرآن کے مذکورہ بالا احکام کے عین مطابق ایک عارضی قیام کے موقع پر اپنے بے شمار ملاقاتیوں کے لئے ایک نظم اس لئے مقرر کرتا ہے کہ تمام ضروری کام بھی انجام پا جائیں اور کوئی ملاقات سے محروم بھی نہ رہے تو کس سنتِ رسول اور کس معقولیت کی بنا پر اس پر آپ نے "فقر نما شہنشاہی" کا جذباتی فقرہ چست فرما دیا اور ذرا سی رنگ آمیزی سے منتظمین کو "دربان" کی تعریف میں داخل کر ڈالا۔

دوسرا معاملہ جو آپ نے پیش فرمایا ہے اس پر بھی آپ نے جذباتیت سے الگ ہو کر غور نہیں کیا۔ جماعت اسلامی یہ کبھی نہیں کرتی کہ وہ دانستہ کسی مقرر کے نام کو اشتہار میں استعمال کرے، درآنحالیکہ تقریر کسی دوسرے کو کرنی ہو لیکن اس کے ساتھ وہ کیسے گارنٹی دے سکتی ہے کہ اس کے پروگرام مشیت کے تصرفات سے بالاتر ہیں اور وہ جس مقرر کا نام اشتہار میں دے دے وہ بیماریوں اور ناگہانی حادثات کے چنگل سے آزاد رہے گا۔ اب جو لوگ خواہ مخواہ جوشیلے پن کی وجہ سے ایسی گارنٹی لوگوں کو اپنی طرف سے دیتے پھریں، ظاہر ہے کہ ان کو مایوسی اور شرمساری سے دوچار ہونے کے مواقع پیش آسکتے ہیں۔

آخری گزارش یہ ہے کہ جن لوگوں نے اپنے کندھوں پر ایسے نازک جذبات کا شیشہ خانہ لاد کر تحریک اسلامی کا کھیل کھیلنے کے لئے میدان کا رخ کیا ہو، ان کو تو ہر قدم پر حادثہ ہائے جانکاہ پیش آئیں گے۔ یہ ایک عجیب نمونۂ ایمان ہے کہ آدمی کے مزاج اور اس کی سمجھ بوجھ کے خلاف ذرا سی کوئی صورت پیش آئی اور ایسے جذبات کا دورہ پڑا اور وہ چلتے چلتے ٹھٹک گیا کہ بس اب مجھے مقصد اور طریق کار میں شک پیدا ہو گیا ہے۔ بھائی! اس بساط پر چینی اور بلّور کے مہرے کام نہ دیں گے؟ (ن - ص)

نیکی کی راہ میں مشکلات کیوں؟

سوال:

آج سے ایک سال قبل دُنیا کے جملہ افعالِ بد سے دوچار تھا، لیکن دُنیا کی بہت سی آسانیاں مجھے حاصل تھیں۔ میں نہ کسی کا مقروض تھا اور نہ منت کش۔ اور اب جب کہ میں ان تمام افعالِ بد سے تائب ہو کر بھلائی کی طرف رجوع کر چکا ہوں، دیکھتا ہوں کہ ساری فارغ البالی ختم ہو چکی ہے اور روٹی تک سے محروم ہوں۔ سوال یہ ہے کہ اچھے اور نیک کام کرنے والوں کے لئے دُنیا تنگ کیوں ہو جاتی ہے، اور اگر ایسا ہے تو لوگ آخر بھلائی کی طرف کاہے کو آئیں گے؟ یہ حالت اگر میرے لئے آزمائش ہے کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑے تو یہ منزل میں کس طرح پوری کروں گا؟

میں اس مسئلے میں بہت بےچینی محسوس کر رہا ہوں!

جواب:

آپ جس صورتِ حال سے دوچار ہیں اس میں میری دلی ہمدردی آپ کے ساتھ ہے، اور میں آپ کا دل دکھانا نہیں چاہتا، لیکن آپ کی بات کا صحیح جواب یہی ہے کہ آپ فی الواقع آزمائش ہی میں مبتلا ہیں، اور اس منزل سے بخیریت گزرنے کی صورت صرف یہ ہے کہ آپ خدا اور آخرت کے متعلق اپنے ایمان کو مضبوط کر کے صبر کے ساتھ نیکی کے راستے پر چلیں۔

آپ کو اس سلسلے میں جو الجھنیں پیش آ رہی ہیں ان کو رفع کرنے کے لئے میں صرف چند اشارات کرنے پر اکتفا کروں گا۔

بدی کی راہ آسان اور نیکی کی راہ مشکل ہونے کی جو کیفیت آپ اس وقت دیکھ رہے ہیں اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارا موجودہ اخلاقی، تمدنی، معاشی اور سیاسی ماحول بگڑا ہوا ہے۔ اس ماحول نے بکثرت ایسے اسباب پیدا کر رکھے ہیں جو برے راستوں پر چلنے میں انسان کی مدد کرتے ہیں اور بھلائی کی راہ اختیار کرنے والوں کی قدم قدم پر مزاحمت کرتے ہیں۔ اگر خدا کے صالح بندے مل کر اس کیفیت کو بدل دیں اور ایک صحیح نظامِ زندگی ان کی کوششوں سے قائم ہو جائے تو انشاء اللہ نیکی کی راہ بہت کچھ آسان اور بدی کی راہ بڑی حد تک مشکل ہو جائیگی۔ ایسا وقت آنے تک لامحالہ ان سب لوگوں کو تکالیف و مصائب سے دوچار ہونا ہی پڑے گا جو اس بُرے ماحول میں راہِ راست کو اپنے لئے منتخب کریں۔

تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ نیکی بجائے خود اپنے اندر دشواری کا ایک پہلو رکھتی ہے اور اس کے برعکس بدی کی فطرت میں ایک پہلو آسانی کا مضمر ہے۔ آپ بلندی پر چڑھنا چاہیں تو بہرحال اس کے لئے کسی نہ کسی حد تک محنت کرنی ہی پڑے گی، چاہے ماحول کتنا ہی سازگار بنا دیا جائے۔ لیکن پستی کی طرف گرنے کے لئے کسی کوشش اور محنت کی ضرورت نہیں، ذرا اعصاب کی بندش ڈھیلی کر کے لڑھک جائیے پھر تحت الثریٰ تک سارا راستہ بغیر کسی سعی و محنت کے خود طے ہو جائے گا۔

آپ پوچھتے ہیں کہ اگر اچھے کام کرنے والوں کی زندگی تنگ ہو جاتی ہے تو دنیا اس طرف رُخ ہی کیوں کرے گی؟ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ اگر اچھے کام کرنے والوں کو دنیا کی تمام سہولتیں اور آسائشیں بہم پہنچنے لگیں،

اور برے کام کرنے والوں پر آفتیں ٹوٹ جایا کرتیں تو پھر کون ایسا احمق تھا کہ برائی اختیار کرتا اور بھلائی سے منہ موڑتا۔ پھر تو کامیابی آسان اور ناکامی دشوار ہوتی، جزا سستی اور سزا مہنگی ہو جاتی، انعام مفت ملتا اور عذاب پانے کے لئے محنت کرنی پڑتی۔

کیا اس کے بعد دُنیا کی اس امتحان گاہ میں انسان کو بھیجنے کا کوئی فائدہ تھا؟ اور کیا اس کے بعد نیک انسانوں کی نیکی کسی قدر و قیمت کی مستحق قرار پا سکتی تھی ــــــــ جبکہ ان کو نیکی کے راستے طے کرنے کے لئے قالین بچھا کے دیئے گئے ہوں؟ ــــــــ درحقیقت اگر ایسا ہوتا تو جنت کے بجائے جہنم کی طرف جانیوالے زیادہ قابل قدر ہوتے!

آپ کا یہ سوال ایک اور لحاظ سے بھی عجیب ہے۔ آپ شاید یہ سمجھ رہے ہیں کہ لوگوں کے راہِ راست پر آنے سے اللہ تعالیٰ کی کوئی اپنی غرض اٹکی ہوئی ہے۔ اس غلط فہمی کی بنا پر آپ پوچھتے ہیں کہ اگر راہ راست مشقتوں اور آزمائشوں سے بھری ہوئی ہے تو دنیا اس راہ پر آئے گی ہی کیوں لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ راہ راست اختیار کرنے میں لوگوں کا اپنا فائدہ ہے، نہ کہ خدا کا، اور اس کے خلاف چلنے میں لوگوں کا اپنا نقصان ہے نہ کہ خدا کا! خدا نے انسان کے سامنے دو صورتیں رکھ دی ہیں اور اسے اختیار دے دیا ہے کہ ان میں سے جسے چاہے انتخاب کر لے۔ ایک یہ کہ وہ اس زندگی کے چند روزہ مزوں کو ترجیح دے کر آخرت کا ابدی عذاب قبول کرلے، دوسرے یہ کہ وہ آخرت کی بے پایاں راحت و مسرت کی خاطر ان تکلیفوں کو گوارا کرے جو دین و اخلاق کے ضابطوں کی پابندی کرنے میں لامحالہ پیش آتی ہیں۔ لوگوں کا جی چاہے تو وہ پہلی صورت کو پسند کریں۔ اگر ساری دُنیا مل کر بھی اپنے انتخاب میں یہ غلطی کر گزرے تو خُدا کا کچھ نہ بگاڑے گی۔ خدا اس سے بے نیاز ہے کہ لوگوں کے صحیح انتخابِ راہ سے اس کا کوئی مفاد وابستہ ہو۔

ــــــــ ✦ ــــــــ

ہمیشہ سفر میں رہنے والوں کے لئے حکمِ قصر

سوال[1]: سفری حالت میں نماز کو قصر کرنا چاہئے بلکہ اس رخصت سے فائدہ نہ اٹھانا بعض کے نزدیک تو

---

[1] سائل کی حسبِ خواہش یہ سوال، جواب کو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا اور انھوں نے اس پر ذیل کے الفاظ میں اپنی رائے ظاہر کی "جو لوگ اپنی ملازمت یا کاروبار کے سلسلے میں دائماً سفر میں رہتے ہیں وہ مسافر کی تعریف سے خارج نہیں ہو جاتے اور نہ ان رعایات سے محروم کئے جا سکتے ہیں جو شریعت نے مسافروں کے لئے رکھی ہیں"۔ (ن۔ ص)

کفرانِ نعمت کی تعریف میں داخل ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس حکم خداوندی کا اطلاق پاکستانی بحری بیڑے (اور اس قسم کی دوسری ملازمتوں) پر بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ جہازوں میں رہن سہن گھر ہی کی طرح ہوتا ہے لیکن جگہ اور اوقات اور آزادی بڑی حد تک محدود ہوتی ہے۔ سات گھنٹے کے روزانہ کام کے بعد سپیشل ڈیوٹیاں بھی دینی پڑتی ہیں۔ پانی بھی احتیاط سے خرچ کرنا ہوتا ہے۔ طوفان کی حالت ہو تو پھر بالکل ایک اضطراری سی کیفیت ہوتی ہے۔

اندریں احوال حکمِ قصر سے فائدہ اٹھانا درست ہے یا نہیں؟

جواب:

بحری بیڑے (یا جس دوسری ملازمتوں اور پیشوں میں بالعموم حالتِ سفر موجود رہتی ہے) کے ملازمین جو ہمیشہ سفر پر رہتے ہیں، نماز قصر کر سکتے ہیں۔ اسی طرح افطارِ صوم بھی ان کے لئے جائز ہے۔ قرآنِ حکیم میں اس رعایت کو ان تمام لوگوں کے لئے بیان کیا گیا ہے جن کو "علیٰ سفر" کی حالت درپیش ہو، خواہ یہ حالت عارضی ہو، خواہ دائمی! اس معاملے میں استثنا یا تخصیص بغیر کسی واضح دلیل اور قوی نص کے کرنا صحیح نہیں ہو سکتا۔ قرآن میں رخصت جس وسعت کے ساتھ دی گئی ہے اس کی تائید مصنف ابن ابی شیبہ کی مندرجہ ذیل روایت سے ہوتی ہے: قال حدثنا وکیع عن الاعمش عن ابراھیم قال جاء رجل فقال یا رسول اللہ انی رجل تاجر اختلف الی البحرین فاصلی رکعتین۔ یعنی ایک شخص نے (نماز کے بارے میں سوال کرتے ہوئے) رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں تاجر آدمی ہوں، بحرین کی طرف میری آمد و رفت رہتی ہے (تو میرے لئے کیا حکم ہے) اس پر رسول اللہ صلعم نے اسے (قصر کر کے) دو رکعتیں پڑھنے کا حکم دیا۔

چنانچہ سوائے امام احمدؒ کے باقی ائمہ ثلاثہ کا یہی مسلک ہے۔

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: فتح القدیر، شرح ہدایہ)

(ع، غ، ح)

شفاعت کا صحیح تصور

سوال:

کسی مولوی صاحب نے ایک اشتہار[1] شائع کیا ہے جس میں آپ پر معتزلی اور خارجی ہونے کا فتویٰ لگایا گیا ہے۔ بنائے فتویٰ یہ ہے کہ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قیامت کے روز امت کے بارے میں شفاعت کے منکر ہیں۔ اس کا حوالہ ترجمان القرآن جلد ۲۶ عدد ۱، ۲ ص ۳۰ سے لیتے ہوئے آیت "جنگ کرو اہل کتاب میں ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں لاتے" کے تشریحی نوٹ کا دیا ہے۔ یہ نوٹ یوں ہے:- "وہاں کوئی سعی سفارش، کوئی فدیہ اور کسی بزرگ سے منتسب ہونا کام نہ آئے گا۔" اسی طرح تفہیمات سے بھی کوئی حوالہ اسی قسم کا اخذ کیا ہے۔

براہِ کرم آپ بیان فرمائیں کہ اہلِ سنت کا عقیدہ شفاعت کے بارے میں کیا ہے، نبی صلعم اپنی امت کی شفاعت کس حیثیت سے کریں گے، نیز آیا وہ ساری امت کی طرف سے شفیع ہوں گے؟

جواب:

خدا ان لوگوں کو نیک ہدایت دے جو دوسروں کی طرف غلط باتیں منسوب کر کے دنیا میں پھیلاتے ہیں اور ان کے اقوال کو ایسے معنی پہناتے ہیں جو قائل کے منشا کے خلاف ہوں۔ اگر الزام لگانے والے بزرگ کے دل میں خدا کا کچھ خوف ہوتا تو وہ اشتہار کی

---

[1] خدا ان مولوی صاحبان کو اپنی ذمہ داریوں کا فہم عطا کرے۔ ان کے سامنے پورے کے پورے اسلام کو دنیا بھر میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً الحاد اور مادہ پرستی کے علمبرداروں کے شدید حملے کا سامنا ہے، لیکن یہ عقیدۂ شفاعت پر مناظروں میں مصروف ہیں۔ ان کے سامنے ایک لادین طاقت پاکستان پر غیر اسلامی دستور مرتب کرنے کے لئے جدّوجہد کر رہی ہے لیکن یہ اس سے بے خبر اعتزال اور کفر کے فتوے لگانے کے دماغی کھیل کھیل رہے ہیں، یہاں کا براوران کی بیگمات کا اٹھایا ہوا طوفانِ بے پردگی ان کے حرموں کے دروازوں اور ان کے وعظ کے منبروں سے ٹکرا رہا ہے اور یہ کلامیات پر اشتہار بازی کر کے دل بہلا رہے ہیں۔ ان کے ہاں اونٹوں کو معافی ہے لیکن ان کی چھلنیاں مچھروں کو خوب چھانتی ہیں۔ کشمکش کے ایک فیصلہ کن لمحہ میں یہ وہ پارٹ ادا کر رہے ہیں جو الحاد و بے دینی کے لئے موجب تقویت ہو سکتا ہے۔ اسلام دشمن عناصر کا یہ حال ہے کہ وہ بنیان مرصوص بن کر اپنے مقصدِ زندگی کے لئے بازی لگا رہے ہیں اور ادھر اسلام کی یہ فوج ہے جو خود تو کیا کرے گی کام کرنے والوں کا راستہ بھی روکنا چاہتی ہے۔ (ن۔ص)

شفاعت سے پہلے مجھ سے لکھ کر پوچھ سکتے تھے کہ تیری ان عبارات کا منشا کیا ہے، اور شفاعت کے بارے میں تیرا عقیدہ کیا ہے۔ میری جن عبارتوں کا انھوں نے حوالہ دیا ہے ان میں سے ایک یہود و نصاریٰ کے غلط عقیدۂ شفاعت کی تردید میں ہے، اور اس کا اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ اس غلط عقیدے کی وجہ سے کس طرح اہلِ کتاب کا ایمان بالیوم الآخر باطل ہو گیا ہے جس کی وجہ سے قرآن میں ان پر الزام لگایا گیا وہ یوم آخر پر ایمان نہیں رکھتے۔ دوسری عبارت میں ان تعلیمات کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوتِ رسالت کے آغاز میں اہلِ مکہ کو خطاب کر کے ارشاد فرمائی تھیں۔ دونوں میں سے کسی مقام پر بھی اسلام کے عقیدۂ شفاعت کو بیان کرنے کا موقع نہ تھا ——— (آفرین ہے اعتزال و خارجیت کا فتویٰ نشر کرنے والے پر جسے قرآن سے اتنا مس بھی نہ تھا کہ وہ یہ تو دیکھ لیتا کہ کس آیت کا موقع و محل کیا ہے اور خطاب کس سے ہے۔ ن۔ ص) ——— کیونکہ اسلام جس شفاعت کا قائل ہے اس کے مستحق اہلِ ایمان ہیں، نہ کہ کفار و مشرکین۔ ان دونوں گروہوں کے بارے میں جو کچھ میں نے کہا ہے وہ وہی کچھ ہے جو قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ "اتقوا یوماً لا تجزی نفس عن نفس شیئاً ولا یقبل منها عدل ولا تنفعها شفاعة ولا هم ینصرون"۔

رہا اسلامی عقیدۂ شفاعت تو وہ قرآن و حدیث کی رو سے یہ ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی عدالت میں شفاعت صرف وہ کر سکے گا جس کو اللہ اجازت دے اور صرف اس شخص کے حق میں کر سکے گا جس کے لئے اللہ اجازت دے۔ ملاحظہ ہو "یومئذ لا تنفع الشفاعة الا من اذن له الرحمٰن ورضی له قولاً" "لا تنفع الشفاعة الا من اذن له" "من ذا الذی یشفع عنده الا باذنه"۔ اس قاعدے کے تحت نبی صلعم آخرت میں یقیناً شفاعت فرمائیں گے، مگر یہ شفاعت اللہ کے اذن سے ہو گی اور ان اہلِ ایمان کے حق میں ہو گی جو اپنی حدِ وسع تک نیک عمل کرنے کی کوشش کرنے کے باوجود کچھ گناہوں میں آلودہ ہو گئے ہوں۔ جان بوجھ کر خیانتیں اور بدکاریاں کرنے والے اور کبھی خدا سے نہ ڈرنے والے لوگ حضورؐ کی شفاعت کے مستحق نہیں ہیں۔ چنانچہ حدیث میں حضورؐ کا ایک طویل خطبہ مروی ہے جس میں آپ جرمِ خیانت کی شدت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قیامت کے روز یہ ظالم لوگ اس حالت میں آئیں گے کہ ان کی گردن پر ان کا خیانت سے حاصل کیا ہوا مال لدا ہو گا اور وہ مجھے پکاریں گے کہ یا رسول اللہ! اغثنی! (یا رسول اللہ! میری مدد فرمائیے) مگر میں جواب دوں گا کہ لا املک لک شیئاً، قد ابلغتک (میں تیرے لئے کچھ نہیں کر سکتا، میں نے تجھ تک خدا کا پیغام پہنچا دیا تھا) ملاحظہ ہو: مشکوٰۃ باب قسمة الغنائم والغلول فیها۔ (ا م)